کشمیری مسلمانوں کا استحصال اور ان کا ردِ عمل

ڈاکٹر محمد سرور عباسی

ڈائریکٹر ادارہ مطالعۂ کشمیریات، آزاد جموں وکشمیر یونیورسٹی، مظفر آباد

۱۰ مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی اور پنجاب کی سکھ ریاست کی افواج کے مابین سبراون (مشرقی پنجاب) کے مقام پر ایک معرکے کا رن پڑا اور میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ ان دنوں پنجاب میں سکھ حکومت کے بانی مہاراجہ رنجیت سنگھ کا سب سے چھوٹا بیٹا دلیپ سنگھ برسر اقتدار تھا۔ چونکہ وہ نابالغ تھا اس لئے کاروبار حکومت اس کی ماں رانی جنداں سرانجام دے رہی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۲ء میں اپنے ایک سردار گلاب سنگھ کو جو بڑا بہادر اور وجیہہ ڈوگرہ راجپوت تھا، جموں کی حکومت اور راجہ کا موروثی خطاب دیا تھا۔ چنانچہ رانی جنداں نے گلاب سنگھ پر اعتماد کرتے ہوئے اسے انگریزوں کے ساتھ صلح کی بات چیت کے لئے مامور کیا۔ انگریزوں نے تاوان جنگ میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ اور پنجاب کا کچھ علاقہ طلب کیا۔ سکھوں کا خزانہ خالی ہو چکا تھا لہٰذا انہوں نے پچاس لاکھ روپیہ نقد ادا کیا اور بقیہ رقم کے عوض وادیٔ کشمیر کے علاوہ دریائے راوی اور سندھ کے درمیان کا پہاڑی علاقہ انگریزوں کو دے دیا۔ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کو مالی خسارہ پورا کرنے کے لئے روپے کی اشد ضرورت تھی۔ گلاب سنگھ نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کشمیر، ہزارہ، گلگت (کچھ حصہ) اور چمبہ کو ۷۵ لاکھ روپے میں انگریزوں سے خرید لیا۔ یہ سودا ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدۂ امرتسر کے ذریعے طے پایا۔ بعد میں ریاست کی حد بندی کے موقع پر گلاب سنگھ نے ہزارہ اور راولپنڈی میں کہوٹہ کے بجائے میرپور میں منادر اور کھڑی کا علاقہ حاصل کیا۔ گلاب سنگھ نے جموں اور کشمیر کو ملا کر ان دونوں علاقوں کو ریاست جموں وکشمیر کا نام دیا اور یہاں انگریزوں کی زیر سرپرستی ایک ایسے نظام حکومت کی بنیاد رکھی جو شخصی تھا۔ یہی طرز حکومت اس کے جانشینوں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ ریاست میں مسلمان کل آبادی کا ۷۸ فیصد تھے۔ اس لئے زندگی کے مختلف شعبوں میں ڈوگرہ شخصی حکومت کا سارا بوجھ انہیں ہی سہنا پڑتا تھا۔ اس صورت حال کا جائزہ ذیل میں لیا جاتا ہے۔

ملازمتوں میں مسلم نمائندگی کا فقدان

کشمیر کے شاہ میری خاندان (۱۳۳۹ء - ۱۵۵۵ء) کے دور حکومت میں مسلمانوں کو سیاسی تفوق ضرور حاصل تھا لیکن انہوں نے ملازمتوں میں اپنی اجارہ داری قائم نہیں کی تھی۔ چک حکمرانوں (۱۵۵۵ء - ۱۵۸۶ء) کے دور میں بھی یہی صورت رہی تھی۔ کشمیری ہندوؤں نے مغلیہ دور (۱۵۸۶ء-۱۷۵۲ء) کی ترقی اور خوشحالی سے بھرپور استفادہ کیا۔ افغانوں (۱۷۵۴ء - ۱۸۱۹ء) نے بھی کشمیری پنڈتوں کو کلیدی عہدوں پر تعینات کیا۔ یہاں تک کہ زمان شاہ کے عہد (۱۷۹۳ء - ۱۷۹۸ء) میں پنڈت تنندہ رام ٹیکو کابل کی دیوانی کے عہدے تک جا پہنچا۔ کشمیر کو ئی ستائیس برس (۱۸۱۹ء - ۱۸۴۶ء) تک سکھوں کے زیر نگین رہا۔ اس عرصے میں یہاں دس گورنر تعینات ہوئے جن میں سے آخری دو مسلمان تھے۔ اس کے برعکس ایک سو ایک سالہ ڈوگرہ راج میں یہاں اٹھائیس وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ان میں سے ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ گلاب سنگھ مسلمانوں کو بطور استحقاق عزت کا مقام، ملازمتیں اور دوسری مراعات دینا اپنے اقتدار کے منافی خیال کرتا تھا چنانچہ اس کے دور میں سرکاری ملازمتوں کو کلیتاً ہندوؤں کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ اس طرح مہاراجہ رنبیر سنگھ کی حکومت کی ابتدا ہی میں ریاست کی انتظامی مشینری پر راجپوتوں، کھتریوں اور کشمیری پنڈتوں نے بالادستی قائم کر لی تھی[1]۔ مسلمانوں کو صرف چھوٹی موٹی صنعتوں میں مزدوری اور معمولی ملازمتیں میسر تھیں[2]۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور میں برہمنوں نے انتظامیہ میں اپنی اجارہ داری قائم کر لی تھی اور مسلمان کاشت کاروں کو ان کے آرام و آسائش کے لئے کام کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا[3]۔

مسلمانوں کا معاشی استحصال

سیاسی استحصال کے ساتھ ساتھ معاشی استحصال نے اہل کشمیر کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اقتدار میں آتے ہی زمین پر زمینداروں کے مالکانہ حقوق منسوخ کر ڈالے۔ اپنے منظور نظر لوگوں کو وادی میں بڑی بڑی

جاگیروں سے نوازا اور مسلمان کسانوں کو ان کا غلام بنا دیا۔ گلاب سنگھ کو دولت سے بے پناہ محبت تھی۔ اس کی ہوس زر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک روپیہ نذر پیش کر کے کوئی بھی شخص اس کی توجہ حاصل کر لیتا تھا[۴] اس حرص کا ایک نفسیاتی پس منظر تھا۔ اس نے کشمیر کو نقد رقم دے کر خریدا تھا اور اب وہ اس رقم کو بمعہ منافع وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تمام صنعتوں پر جن میں آرا مشینیں تک شامل تھیں، اپنی اجارہ داری قائم کر لی تھی[۵]۔ گلاب سنگھ نے جو ٹیکس نافذ کیئے وہ اس قدر ظالمانہ تھے کہ انہیں ادا کرتے عوام کی زندگی غربت و افلاس کا نمونہ بن کر رہ گئی تھی۔ لیفٹیننٹ کرنل ٹورنز Torrens نے کشمیر کی معاشی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

"گلاب سنگھ ٹیکس عائد کرنے اور حصول زر میں اپنے پیشروؤں سے بہت آگے بڑھ گیا۔ سابق حکمرانوں نے بلاشبہ بھاری ٹیکس عائد کر رکھے تھے لیکن اس نے تو عوام کا خون چوس لیا تھا۔ سابق حکمران زمین کی پیداوار، دستکار کی محنت اور کھڈیوں کی کمائی کا زیادہ حصہ سمیٹا لیا کرتے تھے۔ لیکن گلاب سنگھ نے ان کی ہڈیوں کو نچوڑ کر اپنے خزانے میں داخل کیا"[۶]۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے استحصال سے کسانوں کی زبوں حالی انتہا کو پہنچ گئی[۷]۔ ایک انگریز فوجی افسر مسٹر آرتھر برنکین Brinckman نے اس دور کے استحصال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

"کشمیر کے سرسیاح کی نظر سے یہاں کے باشندوں کے لباس کی ناگفتہ بہ حالت گزری ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جونہی کوئی کاشت کار صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہے، اُجلی پگڑی سر پر رکھتا ہے تو اسے کاردار فوراً ٹیکس کی دوہری شرح ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی امارت محض اُجلا لباس پہننے سے فرض کر لی جاتی ہے۔ چنانچہ گندے کپڑے پہننے ہی میں لوگوں کو اپنی عافیت نظر آتی ہے"[۸]۔

رنبیر سنگھ کے دور میں زمین کی پیداوار پر جو مالیہ وصول کیا جاتا تھا وہ پنجاب کے متصلہ اضلاع میں رائج شرح سے تین گنا زیادہ تھا[۹]۔ حکومت پنجاب کی ۱۸۷۸ء۔ ۱۸۷۹ء کی نظم و نسق کی رپورٹ کے مطابق کشمیر میں اناج کی فروخت میں حکومت کو اجارہ داری حاصل تھی۔ ریاست کے بیشتر علاقوں میں کاشتکار لگان جنس کی صورت میں ادا کرتا تھا۔ اگرچہ ضابطہ کی رُو سے اسے پیداوار کا نصف لگان کی صورت میں ادا کرنا ہوتا تھا لیکن دیگر واجبات ملا کر جو کہ کاشت کار سے وصول کیے جاتے تھے اس کے پاس پیداوار کا بمشکل ایک چوتھائی حصہ رہ جاتا تھا[۱۰]۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ نے جو انیسویں صدی کے اواخر میں کشمیر میں برطانوی ریذیڈنٹ کے عہدہ پر فائز رہ چکا تھا لکھا ہے کہ قصاب، نانبائی، بڑھئی، ملاحوں حتیٰ کہ طوائفوں پر بھی ٹیکس عائد تھا۔ سیاحوں کے لیے سامان اٹھانے والے قلیوں کو اپنی کمائی کا نصف حصہ حکومت کو نذر کرنا پڑتا تھا[۱۱]۔ سر والٹر لارنس کا، جو مہاراجہ پرتاب سنگھ کے زمانے میں ریاست میں بندوبست کا کمشنر رہ چکا تھا، بیان ہے کہ: ہوا اور پانی کے سوا ہر چیز پر ٹیکس تھا، طوائفیں اور گورکن بھی ٹیکس ادا کرتے تھے۔ نکاح خوانی کا بھی ٹیکس لیا جاتا تھا[۱۲]۔ اس قدر ٹیکس ادا کرنے والی رعایا سے رنبیر سنگھ کا سلوک انتہائی وحشیانہ تھا۔ ۱۸۶۴ء میں وادی میں قحط نے آفت مچائی۔ اس دوران مہاراجہ نے اپنی بھوکی رعایا کو مچھلی پکڑنے سے منع کر دیا کیونکہ اسے وہم ہو گیا تھا کہ گلاب سنگھ کی روح مچھلی میں حلول کر گئی ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لیفٹیننٹ کرنل ٹورنز Torrens لکھتا ہے کہ:

"کشمیریوں کی غذا مچھلی اور چاول پر مشتمل ہے۔ مہاراجہ کا نیا حکم جس کی رو سے مچھلی پکڑنا منع کر دیا گیا ہے ایک ایسا فرمان ہے جس پر عمل کرتے ہوئے ہزاروں کشمیری بھوکے مر جائیں گے اور اس سے عیاں ہے کہ مہاراجہ توہمات سے متاثر ہو کر کس قدر احمقانہ فرمان جاری کر سکتا ہے"[۱۳]۔

کچھ فاقہ زدہ کشمیریوں نے اپنے بے رحم مہاراجہ کے اس فرمان کی خلاف ورزی کی تو اس جرم کی پاداش میں برہنہ کر کے انہیں گلی سڑی مچھلیوں کے ہار پہنائے گئے اور اسی حالت میں انہیں بغیر کھائے پیئے کے ایک ویرانے میں تین دن گزارنے پر مجبور کیا گیا[۱۴]۔ ۱۸۷۷ء کے موسم خزاں کے دوران وادی میں غیر معمولی بارشیں ہوئیں۔ مالیہ بصورت جنس وصول کرنے میں انتظامیہ کی نااہلی سے تاخیر واقع ہوئی اور فصل کھلیان میں پڑی پڑی اَدھی کے قریب گل سڑ گئی جس کی وجہ سے سخت قحط پڑ گیا۔ اس قدرتی آفت نے وادی کی تقریباً دو تہائی آبادی کو اپنا لقمہ بنا لیا۔ اگرچہ نااہل ریاستی انتظامیہ آفت زدہ مخلوق کی مدد کرنے سے تو قاصر تھی ہی، اس نے بھوکے لوگوں کو نقل مکانی کی بھی اجازت نہ دی جس سے شاید ان کی بھوک کا علاج نکل آتا[۱۵]۔ قحط کا مقابلہ کرنے کے لیے مہاراجہ نے جو قدم اٹھایا اس کے بارے میں ممتاز کشمیری ہندو دانشور پنڈت پریم ناتھ بزاز کی رائے یہ ہے:

"۱۸۷۸ء کے عظیم قحط کے دوران کچھ نامعلوم کشمیریوں نے ایک یادداشت وائسرائے ہند کو بھیجی جس میں رنبیر سنگھ پر کچھ ٹھوس الزامات عائد کیے گئے تھے۔ یہ یادداشت کبھی بھی پوری طرح شائع نہیں ہوئی۔ لیکن بعض دانائے راز برطانوی مصنفین نے اس کے کچھ حصے اپنی کتابوں میں شائع کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے جو الزامات عائد کیے تھے ان کی نوعیت بہت سنگین تھی۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ قحط زدہ عوام کی کفالت کا بوجھ برداشت کرنے کے بجائے مہاراجہ نے کشتیاں بھر بھر کے انہیں جھیل وولر میں غرق کیا"[۱۶]۔

ظلم، استحصال اور قحط کے باعث رنبیر سنگھ کے عہد حکومت کے

آخری برسوں میں ریاست کی معاشی بدحالی انتہا کو پہنچ گئی۔ کشمیر کے دستکاروں کی ہنرمندی کی دنیا بھر میں شہرت تھی۔ لیکن انہیں ان کی محنت کا جو صلہ ملتا تھا اس سے انہیں پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا بھی میسر نہ آتا تھا۔ جب گلاب سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کیا تو کشمیری شال سازی سے پچاس لاکھ روپیہ سالانہ کماتے تھے، اس صدیوں پرانی صنعت کو ڈوگرہ حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۵ء میں یہ صنعت بالکل ناپید ہو چکی تھی۔[۱۷] مسٹر بسکو (BISCOE) کے بقول جو عرصۂ دراز تک سرینگر کے سی ایم ایس ہائی سکول کے پرنسپل رہے، اس صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت غلاموں کی سی تھی۔ انہیں کشمیر سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی اور ان کے ساتھ شرمناک سلوک کیا جاتا تھا۔[۱۸]

دوسری صنعتوں مثلاً کمبل، نمدہ، پیپر ماشی اور چاندی کی مصنوعات کو بھی سخت دھچکا لگا۔[۱۹] ڈوگرہ دور میں کشمیر کی معاشی حالت کا یہ ایک افسوسناک پہلو ہے کہ یہ صنعتیں جو کثیر تعداد میں مسلمانوں کو روزگار مہیا کرتی تھیں برباد ہو گئیں۔ اس وجہ سے ریاست کی تجارت بھی سخت متاثر ہوئی۔ تجارت کے ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس پر مکمل طور پر غیر مسلموں کا قبضہ تھا۔ جنگلات، تعمیرات اور جن چیزوں کی تیاری میں حکومت کو اجارہ داری حاصل تھی۔ ان کے ٹھیکے غیر مسلموں اور غیر ملکیوں کو دیئے جاتے تھے۔ جب ۱۸۸۵ء میں مہاراجہ پرتاب سنگھ گدی نشین ہوا تو اس وقت ریاست کی اقتصادی مشینری بالکل مفلوج ہو چکی تھی۔ مہاراجہ نے مالیہ اراضی کے انتظام کی خامیوں کو دور کرنے کے لیے اپریل ۱۸۸۹ء میں سر والٹر لارنس کو کمشنر بندوبست اراضی مقرر کیا۔ اس نے لکھا:

"۱۸۸۶ء میں ریاست دیوالیہ ہو چکی تھی نہایت زرخیز زمین بغیر کاشت کے پڑی تھی۔ چنانچہ فوج کو متعین کیا گیا کہ وہ کسانوں کو کھیتوں میں کاشتکاری کے لیے مجبور کرے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جب فصل پکتی تو سپاہی آکر مالیہ وصول کرنے کے ساتھ ساتھ خود اپنا حصہ بھی وصول کرتے تھے۔ اس کے بعد بے چارے کسانوں کے پاس جو غلہ بچ رہتا وہ موسم سرما میں جب شدید برفباری ہوتی اور درجہ حرارت صفر سے بھی نیچے گر جاتا تھا ان کی کفالت کے لیے انتہائی ناکافی ہوتا۔"[۲۰]

سر والٹر لارنس نے محسوس کیا کہ کاشت کار ہر چیز اور ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے ان میں خود اعتمادی کا اتنا فقدان تھا کہ زمین کا قبضہ لینے میں انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی تاہم لارنس کی کوششیں ان کا رویہ بدلنے میں کامیاب ثابت ہوئیں۔[۲۱] ڈوگرہ راج کے دوران پہلی بار ریاست میں کسانوں کی بہبود کے لیے صحت مند قدم اٹھایا گیا اور مالیہ نقد صورت میں وصول ہونے لگا اور ان بدعنوانیوں کا کسی حد تک انسداد کیا گیا جو مالیہ کی وصولی کے وقت سرکاری کارندوں سے سرزد ہوتی تھیں۔ ممتاز کشمیری صحافی میر عبدالعزیز نے لکھا کہ آج تک کشمیر کے کسان سر والٹر لارنس کو اپنا محسن اور کرم فرما سمجھتے ہیں۔[۲۲]

ساہوکارہ نظام کی اذیتیں

ہندو ساہوکارہ نظام زراعت و تجارت میں اپنے پنجے پوری طرح گاڑ چکا تھا۔ زرعی معاشرہ جو مسلمانوں پر مشتمل تھا جہالت، پرانے رسم و رواج اور فضول اخراجات کی وجہ سے قرض میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ سود در سود کے چکر، عدالتی ڈگریوں اور نیلامی جائیداد کے خلاف کوئی جائے پناہ میسر نہ تھی۔ قانون بھی ساہوکاروں کا حامی تھا۔ عدالت اور سرکاری مشینری بھی، اس قاہرانہ نظام کے اثرات سرطان کی طرح ہر مسلمان کی زندگی اور خون میں رچ بس چکے تھے۔

بے گار

ایک اور اذیت ناک رواج بے گار کی صورت میں مسلط تھا جسے قانونی تحفظ حاصل تھا۔ ریاست کا چھوٹے سے چھوٹا ملازم پیرزادوں، سیدوں، برہمنوں، ٹھاکروں راجپوتوں اور سکھوں کے سوا کسی بھی شخص کو زبردستی اور بلا اجرت باربرداری اور اس قسم کی کسی اور مشقت کے کام پر ہانک لیتا تھا۔ حکومت کے کارندے جب اور جہاں چاہتے اپنے دوروں کے دوران لوگوں کو ڈیوٹی پر اپنے ساتھ لے جاتے۔ معاوضہ تو کجا انہیں اپنے کھانے پینے کا انتظام خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ پھر انہیں اتنی بھی اجازت نہ تھی کہ کم از کم اپنے بیوی بچوں کو اطلاع دے دیں کہ وہ کہاں اور کتنی مدت کے لیے جا رہے ہیں۔ کوئی نوجوان اور تندرست شخص اس یقین کے ساتھ گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا تھا کہ وہ گھر لوٹ کر آئے گا یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا عذاب تھا جس کی نظیر معاصر دنیا میں موجود نہیں تھی۔ ڈاکٹر آرتھر نیو Arthur Neve نے اپنی کتاب میں بے گار میں پکڑے جانے والوں اور ان کے عزیز و اقارب کے ظاہری اور قلبی کرب کا جس طرح ذکر کیا ہے وہ بڑا دردناک ہے۔[۲۳] بیگار ہی کے سلسلے میں "لندن ٹائمز" کے ای۔ ایف۔ نائیٹ E. F. Knight نے لکھا کہ کشمیر کے حکام ان بدقسمت لوگوں کی ذرا بھر پرواہ نہیں کرتے جنہیں وہ اپنے گھروں اور عزیز و اقارب سے جدا کر کے مہینوں باربرداری کے کام کے لیے استعمال کرتے تھے اور جنہیں یہ باربرداری ریاست کے ویران اور دشوار ترین علاقوں میں کرنی پڑتی تھی۔ ان راستوں سے گزرتے ہوئے ان میں سینکڑوں افراد سردی اور بھوک کی وجہ سے لقمۂ اجل بن جاتے تھے۔ نائیٹ نے آگے چل کر لکھا:

جب ایک شخص کو اس نوعیت کی بیگار میں پکڑا جاتا ہے تو اس کی بیوی اور بچے گریہ زاری کرتے ہوئے اس سے چمٹ جاتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید آئندہ ملاقات نہ ہو سکے۔ ان مظلوم انسانوں کے قافلے کا منظر اس وقت نہایت

دلخراش ہوتا ہے کہ جب یہ اناج کی بھاری بوریاں اٹھائے گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں اسٹور اور گلگت کے درمیان ویران راستوں پر مسلح دستوں کی نگرانی میں چل رہے ہوتے ہیں۔ یہ منظر سائبیریا کی سڑکوں کی یاد دلاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ لوگ کوئی سزا یافتہ ملزم نہیں بلکہ مسلمان کاشت کار ہیں، مہاراجہ کی بے ضرر رعایا۔ ..... کاشت کاروں کو بے گار پر اس وقت مجبور کیا جاتا ہے جب ان کے کھیتوں کو بھی ان کی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی غیر موجودگی میں فصلوں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ انہیں دنوں ٹٹ پونجیا اہلکار کسی ضلع پر ٹوٹ پڑتا ہے اور بیگار کرنے والوں کے ٹولے بھرتی کرنے کی آڑ میں لوگوں سے بڑی بڑی رقمیں ہتھیا لیتا ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بیگار سے جان بچانے کی خاطر بہت سے لوگ اہلکاروں کو رشوت دے کر جو کبھی کبھی سو روپیہ فی نفر ہوتی ہے اپنا آپ بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ایک آدمی بیگار میں پکڑا جاتا ہے تو اس کے مقابلے میں کم از کم دس آدمی ایسے ہوتے ہیں جو رشوت دے کر اپنی گلوخلاصی کرا لیتے ہیں۔ اس طریق کار سے دیہاتی لوگوں کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ذمے کا مالیہ دینے کے قابل بھی نہیں رہتے۔[۲۴]

مذہبی آزادی کا فقدان

مسلمانوں کو پورے طور پر مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی۔ آئے دن مذہبی دلآزادی کے واقعات سے ان کے جذبات کو مجروح کیا جاتا تھا۔ گلاب سنگھ مسلمانوں کو شدھ کر کے ہندو بنانے کا خواہشمند تھا۔[۲۵] رنبیر سنگھ پنڈتوں اور برہمنوں سے راہنمائی حاصل کرتا تھا۔ مسلمانوں کو مذہبی حیثیت سے پریشان کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈوں سے کام لیا جاتا اور انہیں اپنی زندگی ہندوؤں کے مذہبی تعصب کے تابع گزارنی پڑتی۔ ان پر ہندو قوانین لاگو تھے اور ان کی حیثیت ان جانوروں سے بھی بدتر تھی جنہیں قدرت نے ان کے استعمال کے لیے پیدا کیا تھا۔ اسلام میں گائے کا گوشت حلال ہے لیکن ہندو مت میں اسے ماتا کا متبرک درجہ دیا گیا ہے۔ انیسویں صدی میں گائے ذبح کرنے والوں کی سزا موت تھی۔ اکثر اس جرم کی پاداش میں مجرم کو جلتے ہوئے تیل کی کڑاہی میں ڈال دیا جاتا اور پھر لاش سرِ راہ لٹکا دی جاتی تھی۔[۲۶] اس کے بعد یہ سزا عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ پھر اسے دس سال کر دیا گیا۔ ہندو مذہب میں نہ صرف ذبیحہ گاؤ اور سمندر پار کرنے کی ممانعت تھی بلکہ خاوند کی موت کی صورت میں بیوہ کا ستی ہونا یعنی اس کا چتا میں جلنا لازمی تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ جبکہ موخر الذکر دونوں رسمیں ترک کر دی گئیں لیکن ذبیحہ گاؤ کی پابندی اور تعزیراً اسی صورت موجود رہی اور بے گناہ مسلمان اس کی سختیاں سہتے رہے۔ اسلام قبول کرنے کی سزا جائیداد کی ضبطی تھی۔ بہت سی مساجد اور خانقاہوں پر حکومت کا قبضہ تھا۔ ان میں سے اکثر میں غلہ اور گولہ بارود رکھا جاتا تھا۔ سال میں ساٹھ دن جبکہ ہندو برت رکھتے، مسلمانوں کو گوشت کھانے کی ممانعت تھی۔ تاہم انگریز وغیرہ اس پابندی سے مستثنیٰ تھے۔ حتیٰ کہ جانوروں کو بھی گوشت مہیا کیا جاتا تھا۔ قربانی اور دیگر مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لیے بھیڑ بکریاں ذبح کرنے پر ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔[۲۷] مہاراجہ پرتاب سنگھ جو اپنے باپ اور دادا کی طرح کٹر ہندو تھا۔ صبح سے دوپہر تک کسی مسلمان کی شکل دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔[۲۸] ہندو بھی چھوت چھات کے معاملے میں مسلمانوں کو شودروں کی طرح قابل نفرت سمجھتے تھے۔ ہندو تعصب کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے سائے سے بھی بچ کر چلتے تھے اور بقول پنڈت پریم ناتھ بزاز جموں کے بعض علاقوں میں راجپوت اور چھوٹے ملازم اذان میں مخل ہوتے تھے۔[۲۹] معاشرے میں ہندو اس لیے معزز تھا کہ وہ حکمران کا ہم مذہب تھا اور مسلمان اس لیے قابل نفرت کہ وہ مسلمان تھا۔[۳۰] قتل کی سزا موت تھی لیکن پرتاب سنگھ کے عہد تک برہمن اور ڈوگرے اس سزا سے مستثنیٰ تھے۔[۳۱]

شہری حقوق کی غیر موجودگی

پہلے تین ڈوگرہ حکمرانوں کے دور میں بنیادی شہری حقوق کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ تحریر و تقریر پر پابندی تھی۔ نہ کوئی اخبار تھا اور نہ کوئی سیاسی تنظیم ہی قائم کی جا سکتی تھی۔ ووٹ کا حق تھا نہ کوئی جمہوری ادارہ ہی موجود تھا کہ لوگ نظم و نسق، ٹیکسوں اور قانون سازی کے بارے میں اظہار رائے کرتے اور شہری حقوق کا مطالبہ کرتے۔

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی

ریاست میں جدید تعلیم کا آغاز مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور میں ہوا۔ لیکن مسلمان جو غربت اور افلاس میں غرق تھے تعلیم سے بھی بے بہرہ تھے۔ ان کی تعلیمی پستی میں حکومت کی پالیسی اور نیت کا بھی دخل تھا۔ تعلیمی اداروں کا ایسے مقامات پر اجرا کیا گیا تھا جہاں زیادہ تر ہندو آبادی ہی ان سے فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ پھر ان کی تعداد بہت قلیل تھی۔ ۱۹۱۶ء میں ریاست میں ۳۱۱ پرائمری سکول اور ۳۷ مڈل سکول تھے۔[۳۲] اگر ریاست کی آبادی اور رقبے کو پیش نظر رکھا جائے تو ۲۷ مربع میل کے علاقے میں اور ۱۰۶۷۷ افراد کے لیے ایک پرائمری سکول تھا یا ۲۲۸ مربع میل رقبے اور ۸۹۷۴۳ افراد کی آبادی کے لیے ایک مڈل سکول تھا۔ ۱۹۲۲ء میں ریاست میں ۶ سرکاری ہائی سکول اور دو کالج

تھے ۔ دراصل حکومت مسلمانوں کو ایسی حالت میں رکھنا چاہتی تھی کہ جہاں سے وہ کبھی ترقی نہ کر سکیں ۔ ریاست کا محکمہ تعلیم ہندوؤں سے بھرا پڑا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں اس محکمے کے ۵۲ اعلیٰ انتظامی و تدریسی ملازمین میں سے ۴۷ ہندو تھے۔[۳۳] ادنیٰ درجے کے اساتذہ میں بھی مسلمانوں کی تعداد انتہائی قلیل تھی ۔ ہندو اساتذہ مسلمانوں سے اس ہمدردی اور رواداری کا سلوک نہیں کرتے تھے جو مسلمانوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لیے ضروری تھی۔ موجودہ صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں پنجاب صوبائی مسلم لیگ نے کشمیری مسلمانوں کی حمایت میں آواز اٹھائی تھی ۔ لیگ کے ۱۹۰۹ء کے سالانہ اجلاس میں میاں محمد شفیع نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر انکشاف کیا کہ کشمیر میں مسلمانوں کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی ۔ ایک مسلمان استاد کی تعیناتی سے ایک سکول میں چار سو مسلمان طلبہ نے داخلہ لیا ۔ مگر اس کی جگہ ایک ہندو استاد آیا تو ان سب نے پڑھائی چھوڑ دی۔[۳۴] تعلیمی وظائف زیادہ تر ہندو طلبا کو دیئے جاتے تھے ۔ روزنامہ "زمیندار" لاہور نے مارچ ۱۹۲۵ء کی ایک اشاعت میں لکھا کہ گزشتہ کئی برسوں میں حکومت نے جن طلبا کو یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظائف دیئے ان میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا ۔ برطانوی ہند میں حصول تعلیم کے لیے ریاست نے ۲۵ ۔ ۳۰ سالوں میں جن طلبا کو وظائف دیئے ان میں صرف ایک مسلمان کو وظیفہ دیا گیا۔[۳۵] ۱۹۳۱ ـ ۱۹۳۲ء میں حکومت نے ۱۹۰ یتیموں کو وظائف دیئے ان میں صرف ۴۲ مسلمان تھے۔[۳۶] چنانچہ تعلیم سے مسلمانوں کی محرومی کی یہ حالت ہوگئی کہ ۱۹۲۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک کے امتحان میں پاس ہونے والے ۵۱۷ طلبا میں صرف ۶۰ مسلمان تھے ۔ ایف اے کے ۹۸ طلبا میں مسلمان ۱۴، اور بی اے کے ۸۷ طلبا میں ۷ مسلمان تھے ۔ ایف ایس سی کے ۳۸ اور بی ایس سی کے ۱۵ طالب علموں میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔[۳۷] ۳۱ ـ ۱۹۳۲ء میں ریاستی ہائی سکولوں میں ۹۳۴۶ طالب علم زیر تعلیم تھے ان میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۳۶۶۳ تھی۔[۳۸]

جنت میں دوزخ

موسم سرما کے آغاز میں ہزاروں مسلمانوں کو برطانوی ہند میں تلاش روزگار کے لیے جانا پڑتا ۔ اس دوران ان پر جو گزرتی اس کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز بیوروکریٹ، دانشور اور فرزند کشمیر جناب قدرت اللہ شہاب نے لکھا :

"سڑک پر تاحد نظر تتر بتر انسانوں کی لائن ہی لائن لگی ہوئی تھی ۔ میلے میلے بھورے بھورے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس خمیدہ لوگ دو دو تین تین من وزن پیٹھ پر اٹھائے رینگ رینگ کر چڑھائی چڑھ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ انہوں نے خشک گھاس کے بنے ہوئے چپل پہنے ہوئے تھے اور ان کے تمتماتے ہوئے چہرے پسینے میں شرابور تھے ۔ یہ کشمیری مسلمانوں کی قوم "نجیب چرب دست و تر دماغ" کے نمائندے تھے ۔ جنہیں عرف عام میں "ہاتو" کہا جاتا تھا ۔ موسم سرما کے شروع ہوتے ہی وہ اپنا فردوس بروئے زمیں چھوڑ کر پاپیادہ قافلہ در قافلہ پنجاب کے میدانوں میں اُتر جاتے تھے ۔ ان کی مائیں بہنیں اور بیٹیاں تو اپنے برف سے گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے چوبی گھروں میں ساری ساری رات کڑوا تیل جلا کر قالین بنتی تھیں ۔ یا شال اور غالیچے کاڑھتی تھیں یا پھول دار نمدے بناتی تھیں یا اخروٹ کی لکڑی تراش تراش کر نازک نازک سگریٹ کیسوں، تپائیوں اور پھولدانوں پر نقش و نگار کھودتی تھیں جنہیں مقامی ساہوکار اونے پونے داموں خرید کر سیاحوں کے ہاتھ بڑی بڑی قیمت پر بیچ ڈالتا تھا۔[۳۹] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قدرت اللہ شہاب اس کے بعد رقم طراز ہیں :

"حضرت آدم تو دانۂ گندم کی پاداش میں خلد سے نکلے تھے لیکن ڈوگرہ راج میں کشمیری مسلمان دانۂ گندم کی تلاش میں اپنی جنت ارضی سے نکلنے پر مجبور تھا۔ سردیاں آتے ہی وہ ۔ ۔ ۔ ۔ کوہساروں اور مرغزاروں سے نکل کر پنجاب کی دور دراز منڈیوں میں پھیل جاتے تھے ۔ دن بھر غلے اور لوہے اور کپڑے کی بار برداری کرتے تھے ۔ بسوں اور تانگوں کے اڈوں پر سامان ڈھوتے تھے ۔ لکڑی کے ٹالوں پر لکڑیاں پھاڑتے تھے اور شام کو مرغی کے بچوں کی طرح چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اکٹھے بیٹھ کر کچھ چاول اُبال لیتے تھے ۔ خشکہ رات کو کھا کر کھلے آسمان تلے سو رہتے تھے اور صبح اُٹھ کر رات کی بچی ہوئی پیچھ میں نمک ملا کر دن کا کھانا بنا لیتے تھے ۔ اس طرح خون پسینہ ایک کر کے گرمیوں میں جب وہ کچھ نقدی بچا کر اور دو ڈھائی من سامان پیٹھ پر لاد کر اپنی جنت گم گشتہ کی طرف واپس لوٹتے تھے کہیں کسٹم والے ان کا مال لوٹتے تھے کہیں کوئی ڈوگرہ سردار سر عام ڈرا دھمکا کر ان کی پونجی ہتھیا لیتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یوں بھی کشمیری مسلمان کا بال بال ڈوگرہ حکومت کے لاتعداد ٹیکسوں میں جکڑا رہتا تھا ۔ پھولوں پر ٹیکس، سبزی پر ٹیکس، بھیڑ بکری اور گائے پر ٹیکس، چولہا ٹیکس، کھڑکی ٹیکس، اون ٹیکس، شال ٹیکس، نجار اور خیاط پر ٹیکس، مزدور اور معمار پر ٹیکس، نانبائی اور لوہار پر ٹیکس، ملاح اور کمہار پر ٹیکس ارباب نشاط پر ٹیکس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس فقط ایک حمام تھا جو ٹیکسوں کی کڑی کے جالے میں کسی وجہ سے گرفتار نہ تھا۔[۴۰] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " ان سب دشواریوں، رکاوٹوں، پابندیوں اور لوٹ مار کے باوجود کشمیری "ہاتو" اپنی سرزمین سے والہانہ طور پر وابستہ تھا۔ پنجاب کے میدانوں اور منڈیوں میں اسے اُجرت بھی زیادہ ملتی تھی، بیگار بھی کوئی نہیں لیتا تھا اور بڑا گوشت کھانے پر قید کی سزا تھی نہ موت کی لیکن گرمیاں آتے ہی وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پاپیادہ اپنی دور افتادہ وادیوں کی راہ لیتا تھا۔[۴۱]"

کشمیر کے بے بس اور بے کس مفلوک الحال مسلمانوں کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے لکھا :

میں نے کشمیری مسلمانوں کو بڑے بڑے قافلوں کی صورت میں اپنے خوبصورت وطن سے پنجاب کے چٹیل اور سنگلاخ میدانوں کی طرف جاتے دیکھا ...... اپنی شاداب سرزمین ان کے پیٹ کی آگ بجھانے کے سلسلے میں کسی بانجھ کی کوکھ کی طرح خشک ہوگئی تھی۔ جس سے اُگنے والی گھاس بھی زعفران بن جاتی ہے حالانکہ عرفی جیسے شاعر نے اس کی تعریف میں کہا کہ اگر کوئی جھلستا ہوا پرندہ بھی کشمیر پہنچ جائے تو اس میں نئی زندگی پیدا ہوگی اور اس کے بال و پر از سر نو اگ آئیں گے۔ ان مزدوروں کو بانہال اور مری جیسے برفانی کوہستان پیدل طے کرنے پڑتے تھے۔ اور یہ ہزار دقتیں برداشت کرکے آگے بڑھتے ۔ ہر ایک کے ساتھ کھانے پینے کی کچھ اشیاء اور مٹی کے چند ٹوٹے پھوٹے برتن ہوتے تھے جہاں شام ہوگئی وہیں ڈیرہ جما لیا۔ ننگی زمین ان کا فرش اور کھلا آسمان سایہ ہوتا تھا بعض اوقات پہاڑوں کی چوٹیاں عبور کرتے ہوئے وہ طوفانوں کی نذر ہو جاتے ۔ نہ کفن دفن کی نوبت آتی نہ جنازے اور فاتحہ کی باری۔ ان کی بے گور و کفن لاشیں گدھ اور دوسرے آدم خور جانوروں کا لقمہ بن جاتی تھیں۔ کچھ نصیبوں کے مارے سخت جان پنجاب کے شہروں میں پہنچ جاتے تو وہاں بھی غم و الم کے سائے ان پر منڈلاتے ہی رہتے ...... دن بھر خون پسینہ ایک کرکے چند ٹکے کما لیتے تھے جن میں سے اکثر روکھی سوکھی سے شکم پُری کرنے میں اٹھ جاتے۔ رات کسی مسجد یا سرائے میں گزارتے اور وہاں بھی ان کو بے زبان مویشیوں کی طرح ہانکا جاتا ۔ کئی بار میں نے کچھ کشمیری مزدوروں کو روٹی کے لیے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ۔ مجھے شرم سی محسوس ہوئی اور میں نے ایک مزدور سے پوچھا کہ "کیا تم مزدوری نہیں کرتے کہ بھیک کی نوبت آگئی ہے "۔ مزدور نے جواب دیا کہ "جی ہاں ہم مزدوری کرتے ہیں بہت ہوا تو دن میں بارہ سولہ آنے کما لیے لیکن ہم اس پونجی کو جمع کرتے ہیں کیونکہ واپسی پر سرکاری مالیہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ بال بچوں کے لیے کپڑے لتے بنانے پڑتے ہیں اور کچھ چائے نمک ساتھ لے جانا پڑتا ہے اگر اس پیسے کو ہم اپنا پیٹ پالنے پر ہی خرچ کر ڈالیں تو یہ سب اخراجات کہاں سے ادا کریں گے"[۴۲]،،

دیار غیر میں ٹھوکریں کھانے اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے سرکاری خزانہ بھرنے والے اس بے زبان اور بد نصیب کشمیری مسلمان کے لیے عدالتوں، دفتروں، شفاخانوں، غرض ہر شعبہ زندگی پر چھائے ہوئے ہندو اہل کاروں کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔[۴۳] نظام حکومت کی بدعنوانیوں اور ہندو عُمّال کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے وہ اپنے ہی وطن میں اجنبی اور جنت میں دوزخ کی زندگی بسر کرتا تھا۔ آلڈوس ہکسلے Aldous Huxley نے اپنے سفرنامہ میں لکھا :

"کشمیر میں گاڑی کھینچنے کے لیے بیلوں اور گھوڑوں کی ایک جوڑی سے "آدھ درجن انسان سستے پڑتے ہیں۔ اس نوعیت کی بار برداری دیکھ کر میری گردن شرم سے جھک گئی"[۴۴]۔ ..... " یہ ایک اذیت ناک حقیقت ہے کہ انسان کی اس حد تک تذلیل کر دی جائے کہ وہ اس قسم کی مشقت پر مجبور ہو کہ میرے خیال میں حیوانوں سے بھی اتنا کام لینا ظلم ہے۔ موٹر گاڑیوں کے مالک وسکی پینے والے اور دن میں پانچ وقت کھانا کھانے والے مجھے یہ یقین دلاتے رہے کہ کشمیری اس نوعیت کی مشقت کو محسوس نہیں کرتے جتنی شدت سے ہم محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ اس زندگی کے عادی ہو چکے ہیں اور ان کے ذہن میں اس سے بہتر زندگی کا تصور ہی موجود نہیں ہے اور وہ اپنی حالت پر قانع ہیں۔ قابلِ ملامت ہیں وہ لوگ اور نظام حکومت جس نے ان بے چاروں کی یہ حالت بنا رکھی ہے اور جس نے انہیں اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ یہ زندگی کی کسی راحت کا تصور بھی کر سکیں"۔[۴۵]

کشمیری مسلمانوں نے جس پامردی سے ڈوگرہ شخصی راج کا مقابلہ کیا، اس پر مسٹر لیکو نے انہیں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا "اگر برطانوی قوم کو اس ظلم کا سامنا ہوتا جسے کشمیریوں نے برداشت کیا تو ممکن ہے کہ ہم اپنی مردانگی کھو بیٹھتے"۔[۴۶]

ڈوگرہ دور میں ۱۹۳۱ء تک بلا روک ٹوک مسلمانوں کو مصائب و آلام کا نشانہ بنایا گیا۔ اسی سال ۲۹ اپریل کو پولیس کے ایک ہندو انسپکٹر نے جموں میں امام صاحب کو خطبہ عید پڑھنے سے روک دیا اور ۴ جون کو جموں سنٹرل جیل میں ایک ہندو ہیڈ کانسٹیبل نے توہین قرآن کا ارتکاب کیا۔ ان واقعات سے مسلمان سخت مشتعل ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے جلسوں اور جلوسوں پر برسوں سے عائد پابندیوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنیادی انسانی حقوق کے حصول کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس تحریک میں شدت ۲۱ جون کو اس وقت پیدا ہوئی جب سرینگر کے ایک عظیم الشان جلسہ عام میں ایک اجنبی نے اچانک سٹیج پر آکر تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو ڈوگرہ استبداد کے خلاف آمادہ پیکار ہونے کے لیے دعوت فکر دی ۔ اس نے کہا :

"مسلمانو! وقت آگیا ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ یادداشتوں اور گزارشات سے ظلم و ستم میں فرق نہیں آئے گا۔ اور نہ ہی توہین قرآن کا مسئلہ حل ہوگا۔ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ اور ظلم کے خلاف لڑو"۔ اس

نے مہاراجہ کے محل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے للکار کر کہا "اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دو"[۴۷] اجنبی کا نام عبدالقدیر تھا۔ وہ صوبہ سرحد کا رہنے والا اور ایک انگریز فوجی افسر کا خانساماں تھا۔[۴۸]

اس تقریر کی پاداش میں عبدالقدیر خان کو گرفتار کر کے اس پر سیشن جج کی عدالت میں بغاوت کا مقدمہ دائر کیا گیا۔ ہر پیشی پر بڑی تعداد میں لوگ عدالت کی کارروائی سنتے تھے۔ لہٰذا حکومت نے سماعت سنٹرل جیل میں منتقل کر دی، جہاں ۱۳ جولائی کو پیشی تھی۔ اس دن ہزاروں کی تعداد میں لوگ سنٹرل جیل پہنچ گئے اور کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کا مطالبہ کرنے پر تکرار ہو گئی۔ اس پر ڈوگرہ پولیس نے ہجوم پر گولی چلا دی جس سے ۲۱ مسلمان شہید اور ۳۹ زخمی ہوئے۔ اس وقت کے کشمیر کے انگریز وزیراعظم مسٹر ویکفیلڈ نے اپنی یادداشت میں لکھا: "۱۹۳۱ء کے فسادات میں جتنے کشمیری ہلاک کیے گئے، ان کے زخم سینوں پر تھے۔"[۴۹] ۱۳ جولائی کے شہیدوں نے اپنے خون سے جدوجہد آزادی کا جو چراغ جلایا، اس کی روشنی ساری ریاست میں پھیل گئی۔ اس روز عملی طور پر کشمیر میں تحریک آزادی کی بنیاد پڑی جس کے دوران بارہا مسلمانوں پر گولیاں برسائی گئیں۔ لاٹھی چارج کیا گیا۔ کوڑوں اور قید و بند کی سزائیں دی گئیں۔ قیدیوں کو بیڑیاں پہنائی گئیں۔ سیاسی کارکنوں کو جلاوطن کیا گیا، ان کی جائیدادیں نیلام کی گئیں۔ مسلمانوں نے جواب ایک تازہ عزم لے کر اٹھے تھے، حکومت کی ظالمانہ کارروائیوں کا بڑی جرأت سے سامنا کیا۔

یہ تحریک ڈوگرہ استبداد کے سامنے دم توڑ دیتی لیکن برطانوی ہند کے مسلم پریس، اسلامی انجمنوں اور مسلمان رہنماؤں بالخصوص حضرت علامہ اقبال اور آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کے جنرل سیکرٹری سید محسن شاہ ایڈووکیٹ کی بروقت تائید و حمایت نے اسے زبردست تقویت پہنچائی۔ ۱۳ جولائی کے سانحہ کی المناک خبر نے برصغیر کے گوشہ گوشہ میں مسلمانوں میں زبردست ہیجان پیدا کیا۔ انہوں نے کشمیر کی جدوجہد آزادی کی مالی، قانونی اور قلمی امداد کے لیے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے نام سے ایک جماعت تشکیل دی۔ مجلس احرارِ اسلام ہند نے کشمیر میں ذمہ دار نظام حکومت کے قیام کے لیے برطانوی ہند میں ایک ولولہ انگیز تحریک کا آغاز کیا۔

تحریک منزل بہ منزل آگے بڑھی اور مسلمانوں کی پیہم جدوجہد اور قربانیوں کے نتیجہ میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ وہ ریاستی باشندوں کی تکالیف کا جائزہ لینے کے بعد ان کے تدارک کے لیے حکومت کو اپنی سفارشات پیش کرے۔ اس کمیشن کو اس کے صدر مسٹر جے۔ بی۔ گلینسی کے نام پر گلینسی کمیشن کا نام دیا گیا۔ مسٹر گلینسی حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا ایک سینئر آفیسر تھا۔ کمیشن کے غیر سرکاری ارکان میں چوہدری غلام عباس خان، خواجہ غلام احمد عشائی، پنڈت پریم ناتھ بزاز اور مسٹر لوک ناتھ شرما کو شامل کیا گیا تھا۔ مؤخرالذکر کے عدم تعاون کے باوجود کمیشن نے اپنی سفارشات مہاراجہ کو پیش کیں۔ ان سفارشات کو ایک اہم دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ مہاراجہ نے حقائق و واقعات سے مجبور ہو کر سفارشات کو بلا تامل منظور کر کے یہ حکم دیا کہ انہیں جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔ مسلمانوں نے کمیشن کے ساتھ بہت بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اگرچہ کمیشن نے ایک حد تک اصلاح احوال کی کوشش کی لیکن اس کی سفارشات مجموعی اعتبار سے ان کے جائز حقوق سے بہت کم تھیں۔ پھر بھی زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کے آگے بڑھنے کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور حکومت نے انہیں نظر انداز کرنے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس کا خاصا تدارک ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ سفارشات کی منظوری سے ہندوؤں سے وہ کچھ چھن جانے کا امکان بھی پیدا ہو گیا تھا جو اقلیت میں ہونے کے باوجود بربنائے ناانصافی انہیں حاصل تھا۔

اس اثنا میں مسلمانوں نے ایک سیاسی تنظیم بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے نام سے ایک مشترکہ پلیٹ فارم، ایک متحدہ سیاسی تنظیم اور ایک جھنڈا وضع کر کے ایک منظم جدوجہد کا آغاز کیا گیا۔ دو سال بعد ریاست میں ایک قانون ساز اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ ۷۵ ارکان کی اسمبلی میں منتخب ارکان کی تعداد صرف ۳۳ تھی۔ ۱۹۳۴ء اور پھر ۱۹۳۸ء میں محدود بالغ رائے دہی کی بنیاد پر اسمبلی کے انتخابات میں مسلمانوں کی ۲۱ منتخب نشستوں میں سے ہر بار مسلم کانفرنس نے انیس پر کامیابی حاصل کی۔

مسلم کانفرنس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے آل انڈیا کانگرس کے دور بین لیڈروں کو جو کشمیر پر حریصانہ نظریں ڈالے ہوئے تھے سخت پریشان کر دیا اور انہوں نے مسلمانوں کی جمعیت کو پریشان کرنے کے لیے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ اس دوران شیخ عبداللہ پر پنڈت جواہر لعل نہرو کا جادو چل گیا۔ نتیجتاً ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دیا گیا۔

۱۹۴۰ء میں قائداعظم محمد علی جناح کی رہنمائی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں قرارداد لاہور (جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے زبان زدعام ہوئی) منظور ہوئی تو اس نے کشمیر کی سیاست کو بھی بے حد متاثر کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک نئی اسلامی مملکت کے قیام سے قبل ہی اہل کشمیر کی اس سے عقیدت و وابستگی کی وجہ پاکستان کے نام اور تصور میں کشمیر کی موجودگی تھی۔ اس پس منظر

میں نیشنل کانفرنس کے بعض مقتدر رہنماؤں نے اس تنظیم سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور اکتوبر ۱۹۴۰ء میں مسلم کانفرنس کا احیاء کیا۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں چوہدری غلام عباس خان کی سرکردگی میں مسلم کانفرنس نے اپنے سالانہ اجلاس جون میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں برطانوی ہند کی تقسیم اور پاک و ہند کو انتقال اقتدار کے ساتھ ہی ولیسی ریاستوں پر سے بھی برطانوی بالادستی ختم ہو گئی تھی۔ تقسیم جن بنیادوں پر ہوئی تھی ان کے مطابق ریاست کشمیر پاکستان کا لازمی حصہ تھی۔ علاوہ ازیں جغرافیائی حدود اور محل وقوع کے لحاظ سے بھی کشمیر پاکستان کا قدرتی حصہ ہے۔ پاکستان سے فطری لگاؤ اور ریاست کا اس سے الحاق اسلامیانِ کشمیر کا جزو ایمان بن گیا۔ چنانچہ آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس نے ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو ریاست کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی قرارداد منظور کی۔ اس اثنا میں انڈین نیشنل کانگرس نے مہاراجہ ہری سنگھ کو اپنے ساتھ ملانے کی ایک سازش تیار کی جس میں غیر منقسم ہندوستان کا آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی ملوث تھا۔ چنانچہ کانگرس کے صدر مسٹر اچاریہ کرپلانی اور ان کے بعد مسٹر گاندھی نے کشمیر کا دورہ کیا اور مہاراجہ کے ساتھ تفصیلی بات چیت کی۔ مؤخرالذکر کی ترغیب سے مہاراجہ نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا اور پاکستان دشمن سرگرمیوں پر اُتر آیا۔ مہاراجہ نے ہندوستان سے الحاق کی خاطر ریاست کی مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کا ایک خفیہ منصوبہ بنایا۔ چنانچہ اس کی طرف سے وسیع پیمانے پر دباؤ اور تشدد کے خلاف آزاد جموں و کشمیر کے موجودہ صدر مجاہد اوّل سردار عبدالقیوم خان نے اعلان جہاد کیا۔ جہاد کی یہ تحریک جلد ہی ساری ریاست میں پھیل گئی، جس کے دوران محض ہم مذہب ہونے پر سرحدی قبائل اور پاکستانی باشندے کشمیری مسلمانوں کے ریاست کے خلاف جہاد میں شامل ہو گئے جو اپنی آزادی اور تکمیل پاکستان کے لیے لڑ رہے تھے۔ اس جدوجہد سے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر نے جنم لیا۔ جس کے صدر سردار محمد ابراہیم خان مقرر ہوئے۔ ۲۵ اور ۲۶ اکتوبر کی درمیانی رات مہاراجہ ہری سنگھ سرینگر سے جموں بھاگ گیا۔ اس سے پہلے اس نے بھارتی جنرل سے ہندوستان سے الحاق کی درخواست کی تھی۔ درخواست میں جو ایک خط کی صورت میں تھی، مہاراجہ نے پاکستان پر مجاہدین کی پشت پناہی کا الزام عائد کیا تھا۔ ہندوستانی گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جب ۲۷ اکتوبر کی صبح کو کشمیر کا بھارت کے ساتھ عارضی الحاق منظور کیا تو اس سے چند گھنٹے پہلے بھارت ہوائی جہازوں کے ذریعے اپنی فوجیں سرینگر میں اتارنے کا کام شروع کر چکا تھا۔ یہ تو محض رسمی تقاضا تھا ورنہ ہندوستانی جہاز تو پہلے ہی پَر تولے کھڑے تھے۔ اس کارروائی میں ہندوستان کو نیشنلسٹ لیڈر شیخ محمد عبداللہ کی پوری تائید و حمایت حاصل تھی۔ اس پس منظر میں لاہور سے ایک سرکاری اعلان میں کہا گیا تھا کہ الحاق ایک سازش کے تحت کیا گیا ہے۔ اعلان میں مزید کہا گیا کہ:

"حکومت پاکستان کی رائے میں کشمیر کا ہندوستان سے الحاق فریب اور تشدد پر مبنی ہے اس لیے اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔"[۵۰]

اس اعلان کے بعد پاکستان جس کی پالیسی ریاستی معاملات میں عدم مداخلت کی تھی مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں ایک فریق کی حیثیت سے سامنے آگیا۔ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کو جب کشمیر میں بھارتی جارحیت کی خبر ملی تو انہوں نے پاکستانی فوج کو کشمیر میں داخل ہونے کا حکم دے دیا۔ تقسیم ہند کے وقت جو فوج پاکستان کے حصے میں آئی تھی۔ اس میں مسلمان سینئر افسروں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لیے پاکستان کو کچھ وقت کے لیے انگریزوں کی خدمات حاصل کرنا پڑی تھیں۔ پاکستان کی بری فوج کا قائم مقام کمانڈر انچیف سر ڈگلس گریسی تھا۔ اس نے قائداعظم کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ اور یہ مؤقف اختیار کیا کہ سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک کی اجازت کے بغیر کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ منصوبۂ تقسیم ہند کے اعلان کے بعد متحدہ ہندوستان کی افواج اور فوجی سازو سامان کی تقسیم کا کام فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لیے اس عہدے کا نام سپریم کمانڈر رکھا گیا تھا۔ اگرچہ اس کو ہندوستان اور پاکستان کے کمانڈر انچیفوں کے مقابلے میں امتیازی پوزیشن حاصل تھی۔ لیکن افواج کی جنگی کارروائی پر اسے کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔[۵۱] جنرل گریسی نے قائداعظم کے حکم کی عدم تعمیل کے بعد ہدایات کے لیے فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک کو فون کیا جو اس وقت دہلی میں تھا۔ ۲۸ اکتوبر کو آکنلک نے لاہور آکر قائداعظم سے تبادلہ خیال کیا اور قائداعظم کو واضح طور پر کہہ دیا کہ اگر پاکستان نے بھارت کے خلاف فوج کشی کی تو پاکستانی بری فوج کے انگریز افسر واپس بلا لیے جائیں گے۔ مجبوراً قائداعظم کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ چوہدری غلام عباس خان، قائداعظم سے آخری ملاقات کے زیر عنوان ۹ ستمبر ۱۹۶۷ء کے ہفت روزہ "کشیر" راولپنڈی میں لکھتے ہیں:

"میری اور قائداعظم کی آخری ملاقات کا ذکر ہے میں انہیں ملنے کراچی گیا ہوا تھا۔ مسئلہ کشمیر پر بات چھڑ گئی۔ قائداعظم نے جنرل گریسی سے اپنی گفتگو کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔" اس کے بعد میں نے کابینہ کا اجلاس طلب کر کے یہی تجویز اپنے رفقاء کے سامنے رکھ دی، لیکن تم جانتے ہو کہ کیا نتیجہ نکلا؟ کابینہ نے متفقہ طور پر میری تجویز مسترد کر دی۔ اس لیے کشمیر کے معاملے میں ہم نہ صرف صحیح بس کھو بیٹھے بلکہ غلط بس میں بٹھا دیے گئے ہیں۔" چوہدری غلام عباس خان کے اس استفسار پر کہ: "آپ نے معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر انہیں تجویز منوانے

پر زور کیوں نہ دیا؟ قائد اعظم نے فرمایا: تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن تمہیں یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں علاوہ اور وجوہ کے اب آئینی سربراہ بھی ہوں۔ کابینہ کے فیصلے کو شاید بحیثیت جناح تو میں نظر انداز کر سکتا تھا لیکن بحیثیت گورنر جنرل ایسا کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔"

سردار محمد ابراہیم خان اپنی سوانح عمری "متاع زندگی" میں لکھتے ہیں:

"اس دوران میں قائد اعظم نے اپنی فوجوں کو سرینگر اور جموں پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا مگر ان کی حکومت کے ممبران ان سے اتفاق نہ کر سکے۔ قائد اعظم نے خود بتایا اور بڑے غصے سے کہا تھا کہ محض حکومت کے ممبران کی کم ہمتی کی وجہ سے ایسا ہوا۔"[۵۲]

مارچ اپریل ۱۹۴۸ء میں جب ہندوستانی فوج نے آزاد کشمیر پر پے در پے حملے شروع کیے اور اس فوجی پیش قدمی سے ہزاروں مسلمانوں کو ریاست سے ہجرت کرنا پڑی اور خود پاکستان کی سلامتی کے لیے شدید خطرہ پیدا ہو گیا تو ۹ مئی ۱۹۴۸ء میں پاکستان کو بعض دفاعی مورچے سنبھالنے کے لیے محدود تعداد میں اپنی فوج کشمیر بھیجنا پڑی۔ اگرچہ پاکستانی فوج نے بعض مقامات پر ہندوستانی فوج پر کاری ضربیں لگائیں اور اسے پیچھے دھکیل دیا لیکن پھر بھی ہندوستان آزاد کشمیر کے خاصے رقبے پر قابض ہو گیا تھا۔

اس اثنا میں ہندوستان نے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پاکستان کے خلاف کشمیر میں فوجی جارحیت کی شکایت کی۔ پاکستان نے بھی جوابی شکایت دائر کر دی۔ سلامتی کونسل نے اقوام متحدہ کا ایک کمیشن ہندوستان اور پاکستان کے مابین حقائق کی چھان بین اور فریقین کے درمیان مصالحت کرانے کے لیے بھیجا۔ یہ کمیشن ایک معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جو اس کمیشن کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کی صورت میں ہے۔ ان قراردادوں کی رو سے سلامتی کونسل، ہندوستان اور پاکستان نے متفقہ طور پر طے کیا تھا کہ جنگ بندی اور ریاست سے فوجی انخلا کے بعد ریاست کے مستقبل کا فیصلہ عوام آزادانہ استصواب کے ذریعے کریں گے۔ یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو فریقین نے جنگ بندی کا اعلان کیا۔ لیکن ہندوستان کی پیدا کردہ رکاوٹوں کے باعث کمیشن ریاست سے فوجی انخلا اور رائے شماری کرانے میں ناکام رہا۔ دراصل بھارت کا رائے شماری سے انحراف اس کے اس اندیشہ کا نتیجہ ہے کہ جب کبھی اہل کشمیر کو ووٹ کے ذریعے اپنے مستقبل کا تعین کرنے کا موقع دیا گیا تو وہ اپنی رائے کا اظہار پاکستان کے حق میں کریں گے۔ بھارت نے ہمیشہ عالمی رائے عامہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کشمیر کو مذہب کی بنیاد پر حاصل کرنا چاہتا ہے اگرچہ مذہب ہی تقسیم ہند کی تسلیم شدہ بنیاد ہے لیکن معاشی اور جغرافیائی عوامل کا بھی یہی تقاضا ہے۔

حوالہ جات

1. Lucullus, *The Kashmir Raj*, Lucknow, 1867, pp.3-4.
2. Ansely, Mrs. J.C. Murray, *Our Visit to Hindostan, Kashmir and Ladakh*, London, 1879, p.75.
3. Lawrence, Sir Walter, *The India We Served*, London, 1928, pp.126-27.
4. Drew, Frederic, *The Jammu and Kashmir Territories*, London, 1875, p.15
5. Knight, E.F, *Where Three Empires Meet*, London, 1893, p.45.
6. Torrens, Lt. Col., *Travels in Ladakh, Tartary and Kashmir*, London, 1863, p.301.
7. Temple, Sir Richard, and Temple, Capt. Richard Cornac, *Journals Kept in Hyderabad, Sikkum, Kashmir and Nepal*, Vol.I, London, 1887, p.302
8. Quoted by Lucullus, *op.cit.*, p.29.
9. Young husband, Sir Fracis, *Kashmir*, London, 1909, p.177.
10. Vide *Census of India 1901*, Vol xxii, p.21.
11. Young husband, Sir Francis, *op.cit.*, p.179.
12. Lawrence, Sir Walter, *op.cit.*, p.134.
13. Torrens, Lt. Col., *op.cit.*, p.306.
14. Quoted by Lucullus, *op.cit.*, p.20.
15. Younghusband, Sir Francis, *op.cit.*, pp.180-81.
16. Bazaz, P.N..... Struggle for Freedom in Kashmir, p.312.
17. For details see Bazaz, P.N. *Inside Kashmir*, Srinagar, 1911, pp.77-79
18. .Biscoe, Tyndale, *Kashmir in Sunlight and Shade*, London, 1922, p.155.
19. Bazaz, P.N. *Inside Kashmir*, p.79.
20. Lawrence, Sir, Walter, *op.cit.*, p.127.
21. For details see, Lawrence Walter R., *The Valley of Kashmir*, London, 1895, pp.424-25.

۲۲۔ میر عبدالعزیز، "کشمیر کی تحریک آزادی" لاہور، س۔ن، ص ۳۰

23. For details see Neve, Dr. Arthur, *Thirty Years in Kashmir*, London, 1913, 1913 pp. 139-40.
24. Knight, E.F., *op.cit.*, pp.69-69.

۲۹۔ قدرت اللہ شہاب "شہاب نامہ" لاہور، ۱۹۸۷، ص ۴۴ - ۴۵

۴۰۔ ایضاً ۔ ص ۴۶ - ۴۷

۴۱۔ ایضاً ۔ ص ۴۸

۴۲۔ شیخ محمد عبداللہ "آتش چنار" ۔ لاہور (س ۔ ن) ص ۳۷ ۔ ۳۸

43. Bazaz, P.N., *Inside Kashmir,* p.205.

44. Huxley, Aldous, *Jesting Pilate,* London, 1926, p.21.

45. *Ibid.*, p.22

46. Biscoe, *op.cit.*, p.79.

۴۷۔ رشید تاثیر "تحریک حریت کشمیر (۱۹۳۱ - ۱۹۳۹ء) حصہ اوّل سرینگر، ۱۹۶۸ء ۔ ص ۔ ۹۶ ۔

48. *Brief Notes on the Administration of Jammu & Kashmir State for the year 1931,* Srin agar, 1932, p.2.

49. **Wakefield,** G.E.C., *Recollections,* Lahore, 1943, **p.193.**

50. **Quoted in** Muhammad Ali,Chaudhri, *The Emergence of Pakistan*, Columbia University Press, 1967, p.296

51. Fazal Maqeem Khan, Maj. General, *The Story of the Pakistan* Army, Lahore, 1963, pp.21-22 and 26-27.

۵۲۔ سردار محمد ابراہیم خان "متاع زندگی"، کلاسیک، لاہور، س ۔ ن ص ص ۱۶۵ - ۱۶۶ ۔

25. Korbel, Josef, *Danger in Kashmir,* Princeton, 1954, p.15

26. Biscoe, Tyndale, op.cit., p.12.

27. Inference from *Report of the Commission appointed dtinder the orders of His Highness the Maharaja Bahadur dated 12th November, 1931 to equire into grievances and complaints (known as Glancy Commission Report),* Jammu, 1932 pp.46-47.

۲۸۔ میر عبدالعزیز، ک م ب ۔ ص ۳۱ ۔

29. Bazaz, P.N. *Inside Kashmir*, p.68.

30. *Ibid.*, p.250.

31. Gwashalal, P., *A Short History of Kashmir,* Lahore, 1932, p.94.

32. *Glancy Commission Report,* op.cit., p.9.

۳۳۔ اداریہ روزنامہ "زمیندار" لاہور ۔ ۷ مارچ ۱۹۲۴ء

۳۴۔ روزنامہ "پیسہ اخبار" لاہور ۲۸ اکتوبر ۱۹۰۹ء

۳۵۔ اداریہ روزنامہ "زمیندار" لاہور ۷ مارچ ۱۹۲۴ء

36. *Glancy Commission Report,* Op.cit., p.13.

37. *Result Gazette Punjab University*, 19 22.

38. *Glancy Commission Report, op.cit.,* p.11.

روزنامہ انقلاب اور تحریک پاکستان ۔ منتخب اداریے

بقیہ صفحہ ۵۷

غلط ہیں اور شملہ کانفرنس کے سلسلے میں ملک خضر حیات خان سے جو لغزش ہوئی اس کے باوجود ہماری پختہ رائے یہی ہے کہ وہ مسلمانوں کے اتحاد کے بہ دل قائل ہیں اور اسے از سر نو قائم کرنے کے ہر موقع کا تہہ دل سے خیر مقدم کریں گے۔

"مختلف گروہوں کو ہماری بات اچھی لگے یا بری لگے لیکن حق یہ ہے کہ اس ساری کشمکش میں ملت کے وسیع فوائد اور عمومی مصلحتوں کا خیال کسی نے نہ رکھا سب محدود اغراض اور ذاتی کشمکشوں میں مبتلا ہو گئے اور عوام فریبی کے لئے انہیں ملی مقاصد کا رنگ دیتے رہے ہماری دردمندانہ التجا ہے کہ اب فیصلہ کن ساعت سر پر آ گئی ہے؟ خدا کے لئے پہلی تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے اتفاق و اتحاد کی طرف آیئے۔ لیگ والے اگر ملک خضر حیات خان سے بڑھ کر ملت کی بہبود کے محافظ ہیں تو اس دعوے کا عملی ثبوت بہم پہنچانے کا موقع یہی ہے۔ انہیں سب سے پہلے اتحاد کی صدا بلند کرنی چاہیئے۔ ملک خضر حیات خان اگر اپنے مختلف دعاوی میں مخلص ہیں تو ان کے لئے بھی یہی راستہ ہے۔ (روزنامہ انقلاب ۔ اداریہ ۴ اگست ۱۹۴۵ء)